تاریخِ ادبِ اُردو

(جلد چہارم)

ڈاکٹر جمیل جالبی

مجلسِ ترقیِ ادب ○ لاہور

Scanned with CamScanner

اردو مرثیہ کا نقطۂ عروج

باب اول

میر ببر علی انیسؔ

میر ببر علی انیس مشہور مرثیہ گو میر مستحسن خلیق کے بیٹے، مشہور زمانہ مثنوی ''سحر البیان'' کے مصنف میر حسن کے پوتے اور ہجو نگار میر ضاحک کے پر پوتے تھے۔ شاعروں کے اسی خاندان میں میر انیس محلّہ گلاب باڑی فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ میر انیس کے سال پیدائش پر اہلِ علم میں اختلاف ہے۔ امیر احمد علوی ۱۲۱۶ھ بتاتے ہیں [۱]۔ مولانا شبلی تقریباً ۱۲۱۸ھ [۲]، اکبر حیدری کاشمیری ۱۲۱۸ھ [۳] مسعود حسن رضوی ادیب [۴] ۱۲۲۰ھ بتاتے ہیں لیکن انیس کے سالِ وفات ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء پر سب کو اتفاق ہے اور یہ مستند ہے۔ میر مونس کے شاگرد سید محمد زکی الم کا نو شعروں پر مشتمل ایک فارسی قطعہ تاریخِ وفات [۵]، ۲۹ر دسمبر ۱۸۷۴ء کے اودھ اخبار لکھنؤ میں شائع ہوا تھا جس سے انیس کے سال ولادت کی گتھی سلجھ جاتی ہے۔ اس قطعہ کے مفید مطلب شعر یہ ہیں:

اے وائے شد خزاں چو بہارِ گلِ سخن — از باغ نظم بلبلِ رنگیں کلام رفت
می بود پنج شنبہ و بست و نہم زعید — قبل از غروب پیشِ شہِ خاص و عام رفت
غسل و نماز گشت بہ شب عن قریبِ صبح — آں آفتاب در لحدِ تیرہ فام رفت
سہ سال و چند ماہ بہ ہفتاد شد فزوں — چوں آں رفیع مرتبہ و ذوالکرام رفت
از دل الم کشید سرِ آہ و زد ندا — سوئے ارم انیس امامِ انام رفت [۶]

(۱۲۹۱=۱-۱۲۹۲ھ)

ان اشعار سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ۲۹ر شوال، جمعرات کو غروبِ آفتاب سے قبل انیس کا انتقال ہوا۔ رات ہی کو غسل دیا گیا، نماز ادا کی گئی اور عن قریب صبح انیسؔ کی تدفین ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ۷۳ سال اور کچھ مہینے تھی۔ اس طرح اگر ۱۲۹۱ھ سے ۷۳ سال کم کر دیے جائیں تو انیس کا سال پیدائش ۱۲۱۸ھ برآمد ہو جاتا ہے۔ یہ نہ صرف معاصر شہادت ہے بلکہ یہ قطعہ انیسؔ کی وفات کے ۱۹ دن بعد اودھ اخبار لکھنؤ میں شائع ہوا۔ اس وقت سارے اہلِ خاندان بقید حیات تھے۔ خود قطعہ گو کے خاندانِ انیس سے قریبی مراسم تھے۔ الم میر مونس کے شاگرد تھے۔ اب اس وقت تک کے لیے اسی سالِ ولادت کو قبول کر لینا چاہیے جب تک کوئی

Scanned with CamScanner

دوسری، اس سے بھی پکی شہادت سامنے نہ آجائے۔ اودھ اخبار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انیس کا انتقال جگر کا وَرم (ورم کبد) اور بخار (تپ) سے ہوا۔ اسہالِ کبد کی وجہ سے وہ ہڈیوں کی مالا بن کر رہ گئے تھے۔ بستر مرگ پر کئی رباعیاں کہیں جن میں سے ایک یہ ہے:

ہر آن گھٹی جاتی ہے طاقت میری بڑھتی ہے گھڑی گھڑی نقاہت میری
آتا نہیں آبِ رفتہ پھر جو میں انیس اب مرگ پہ موقوف ہے صحت میری

مرزا دبیر نے بھی انیس کا قطعہ تاریخ وفات کہا جس پر انیسیوں نے فنی سقم نکال کر اعتراض کیا اور اودھ اخبار میں خط چھپوا دیا۔ اس کے جواب میں دبیر نے ایک خط شائع کیا اور حاتم علی مہر نے اس بحث پر ایک "رسالہ" شائع کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ برسوں بعد سید مسعود حسن رضوی ادیب نے دبیر کے اس قطعہ تاریخ وفات کو سنگ مرمر کی لوح پر کندہ کرایا اور مزارِ انیس پر نصب کرا دیا جو آج بھی ہجر گذشتہ کو وصلِ امروز میں بدل رہا ہے۔ مرزا دبیر کے اس فارسی قطعۂ تاریخ وفات سے، زبر و بینہ کے حساب سے، ۱۲۹۱ھ تک پہنچنے کی تفصیل امیر احمد علوی نے اپنی تصنیف "یادگارِ انیس" میں دی ہے [۷]۔ دبیر کے اس قطعہ کے تین شعر یہ ہیں:

سالِ تاریخش بزبر و بینہ شد زیبِ نظم
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس (۱۲۹۱ھ)
در سنینِ عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف
گرچہ طبعم بود محزوں و مکدر بے انیس
آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامین
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

انیس کے بھائی میر مونس کے فارسی قطعۂ تاریخ کے آخری مصرع کے تین لفظوں "اکمال نظم برباد" سے بھی ۱۲۹۱ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اس قطعہ کا آخری مصرع "گفتا اکمال نظم برباد" ہے۔ وفات کے وقت قمری حساب سے ۷۳ برس اور عیسوی حساب سے ۷۱ سال عمر پائی۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے بیس کے قریب قطعاتِ تاریخ وفات جمع کیے ہیں جن سے ۱۲۹۱ھ برآمد ہوتے ہیں [۸]۔

میر ببر علی انیس (۱۲۱۸ھ-۱۲۹۱ھ/۱۸۰۳ء-۱۸۷۴ء) پہلے حزیں تخلص کرتے تھے لیکن جب ایک دن میر خلیق بیٹے کو لے کر شیخ امام بخش ناسخ کے ہاں گئے اور ناسخ نے ان سے کلام پڑھنے کے لیے کہا تو شیخ صاحب مطلع سن کر جھومنے لگے۔ میر خلیق سے کہا: فرزند ہونہار ہے لیکن بجائے حزیں کے تخلص کچھ اور ہو تو بہتر ہے۔ میر خلیق نے کہا "آپ ہی کوئی تخلص تجویز فرمائیے۔ شیخ صاحب نے تھوڑی دیر سکوت کر کے فرمایا کہ مجھ کو تو انیس پیارا معلوم ہوتا ہے۔ حزیں نے بہ کمال ادب سلام کیا اور اسی وقت سے وہ انیس ہو گئے [۹]۔

شاعری میں میر انیس اپنے والد میر مستحسن خلیق کے شاگرد تھے لیکن علوم متداولہ انھوں نے میر نجف

Scanned with CamScanner

علی فیض آبادی سے حاصل کیے اور عربی کی تکمیل لکھنؤ میں اپنے ہم محلّہ مولوی حیدر علی سے کی۔ عربی و فارسی دونوں زبانیں انھیں خوب آتی تھیں جن سے انیس نے اپنے مرثیوں میں حسبِ ضرورت استفادہ کیا۔ ان کا حافظہ بھی بہت اچھا تھا۔ امیر احمد علوی نے لکھا ہے کہ ایک روز کوئی صاحب ''صدرہ'' کی ایک عبارت پر بحث کررہے تھے۔ میر صاحب نے اس مسئلہ کو بغیر کتاب دیکھے اس خوبی سے حل کر دیا کہ سب سن کر دنگ رہ گئے [۱۰]۔

قرآن و حدیث سے بھی واقف تھے جن سے مرثیہ گوئی میں انھوں نے فائدہ اٹھایا۔ علم عروض پر بھی انھیں دسترس حاصل تھی۔ اس کی اصطلاحات کو انیس نے اپنے کئی مرثیوں میں اظہارِ مطلب کے لیے خوش اسلوبی سے استعمال کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سپاہ گری تو ختم ہوگئی تھی لیکن فنون سپہ گری سے اُمراء و طبقۂ خواص کی دلچسپی برقرار تھی۔ انیس نے بھی نیزہ بازی اور دوسرے فنون کی مشق کی۔ لکھنؤ میں اپنے پڑوسی میر کاظم علی سفید پوش کے بیٹے میر امیر علی سے جو پٹے، بانک، بنوٹ کے استاد تھے ''علی مد'' لکڑی کا ٹھاٹھ اور بانک بنوٹ کی گھائیاں سیکھیں'' [۱۱]۔ اس طرح یہ سب علوم و فنون حاصل کر کے وہ اپنے دور کے کلچر میں رچ بس گئے اور ان سب کا اثر ان کی مرثیہ گوئی پر پڑا۔ انیس کی رزم نگاری میں ان فنون کے اثرات واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔

میر انیس کا خاندان کم از کم پانچ پشتوں سے شعر و ادب کا خاندان تھا۔ ورثے میں مال و دولت کے بجائے انھیں بھی شاعری ملی تھی۔ انیس کے والد اور سارے چچا بھی شاعر تھے۔ ہوش سنبھالا تو گھر کی اس فضا کی خوشبو سے معطر ہوگئے اور غزلیں کہنے لگے۔ باپ نے نصیحت کی کہ غزل کو سلام کرو اور دین و دنیا دونوں کو سنوارنے والی شاعری سے اپنا مستقبل روشن کرو۔ سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے کہ ''عہد شباب میں جب کہ فیض آباد میں تھے اوائل میں چند غزلیں کہی تھیں، جب سے لکھنؤ میں تشریف لائے، شوق مرثیہ گوئی کا ہوا۔ وہ سب غزلیں یک قلم دھوڈالیں۔ نسیاً منسیاً کیں۔ الحق مرثیہ ایسا کہا اور پڑھا کہ چرچا دور دور ہوا اور مرثیہ ان کا عام فہم و عام پسند ہوا۔ الغرض مرثیہ پڑھنے و بتلانے میں یدِ طولیٰ حاصل کیا'' [۱۲]۔

انیس نے اپنا پہلا مرثیہ اکرام اللہ خاں کے امام باڑے واقع محلّہ نخاس میں پڑھا۔ میر ضمیر بھی موجود تھے کہ میر خلیق نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے بھتیجے سے کچھ پڑھواؤں۔ میر ضمیر نے فرمایا بسم اللہ۔ میر انیس نے پہلے رباعی، پھر سلام اور اس کے بعد مرثیہ پڑھا اور اس انداز سے پڑھا کہ یہ رنگِ سخن اہلِ محفل کے دلوں میں اُتر گیا اور سارے شہر میں چرچا ہونے لگا [۱۳]۔ ابتدا میں میر انیس محبانِ حسین کو رلانے کے لیے مختصر مسکی مرثیے پڑھتے تھے۔ ساز و رہین پر ہوتا تھا۔ بین میں میر خلیق بھی کامیاب تھے لیکن انیس کی شاعری اور مرثیہ خوانی کے انداز نے جلد ہی اپنی جگہ بنالی اور مجلسوں میں ان کی مانگ بڑھ گئی:

ہوا سخن کے سبب شہر شہر میں شہرہ

جدھر قلم کی طرح ہم چلے زباں سے چلے (میر انیس)

اب تک میر انیس فیض آباد میں مقیم تھے۔ مرثیہ پڑھنے کے لیے حسب ضرورت لکھنؤ آتے رہتے تھے لیکن امجد علی شاہ کے دور (۱۸۴۲ء-۱۸۴۷ء) میں کسی وقت یا اس سے کچھ پہلے مستقل طور پر لکھنؤ آ گئے۔ سوانح لکھنؤ (روزنامچہ) میں نجات حسین خاں عظیم آبادی نے ۲۶ ربیع الاوّل ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء کے روزنامچے میں ایک مجلس کا ذکر کیا ہے جس میں میر انیس نے مصطفیٰ خاں کے امام باڑے میں مجلس پڑھی تھی اور نجات حسین خاں اس میں شریک تھے'' [۱۴] نواب دیانت الدولہ بہادر میر انیس کے مداح و معتقد تھے۔ ان کے امام باڑے میں پہلی مجلس میر انیس ہی نے پڑھی تھی اور نواب صاحب نے رہنے کے لیے ایک محل سرا ان کی نذر کر دی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوتِ عظیم تک انیس کا خاندان اسی محل سرا میں مقیم تھا [۱۵]۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دبیر سیتاپور چلے گئے تھے اور انیس کاکوری آ گئے تھے۔ جب امن بحال ہوا تو یہ لکھنؤ واپس آ گئے مگر اب وہ لکھنؤ نہیں رہا تھا۔ شہر کی معاشی حالت تباہ ہو چکی تھی اور مجلسوں کی روایت بھی بکھر کر بے رنگ ہو گئی تھی۔ نہ وہ قدر دان رہے تھے اور نہ ولولہ باقی رہا تھا جو زندگی کو بامعنی و توانا بناتا ہے۔ انیس نے اپنے سلاموں میں اس انقلاب کا کئی جگہ ذکر کیا ہے:

الٹ گیا نہ فقط لکھنؤ کا اک طبقہ — انیس ملکِ سخن میں بھی انقلاب آیا
ورق الٹ گیا دنیا کا یک بیک کیوں چرخ — یہ کس طرح کا زمانے میں انقلاب آیا
یہ انقلاب غضب کا ہے یا علی فریاد — کہ مسجدیں تھیں جہاں واں شراب خانہ ہوا
مکیں رہے نہ مکاں طرفہ کارخانہ ہوا — زمیں الٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا

اب انیس مالی مشکلات کا شکار ہو گئے اور لکھنؤ چھوڑ کر کہیں نہ جانے والے انیس مرثیے پڑھنے ہر سال پٹنہ جانے لگے۔ ۱۸۵۹ء میں انھوں نے پٹنہ کا پہلا سفر کیا۔ اب واجد علی شاہ کی سلطنت کی ضبطی (۷ فروری ۱۸۵۶ء) کو تین سال اور بغاوت عظیم کو دو سال سے زیادہ گزر چکے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے الہ آباد و بنارس کے سفر کیے۔ ان کا آخری سفر حیدر آباد دکن کا سفر تھا۔ وہ نواب تہور جنگ کی دعوت پر ۲ مارچ ۱۸۷۱ء کو لکھنؤ سے روانہ ہوئے اور گیارہ مارچ ۱۸۷۱ء کو حیدر آباد پہنچے [۱۶]۔ یہاں میر انیس کی ایسی پذیرائی ہوئی کہ جیسے شاہوں کی ہوتی ہے۔ نذرانہ بھی خوب ملا۔ خواص و عوام ان کو دیکھنے اور ان کی مجلسوں کو سننے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اپنے ایک فارسی خط بنام مونس میں انیس نے لکھا کہ ''تاریخ اول مجمع مردماں قریب پنج ہزار آدم مجتمع بدوند'' [۱۷]۔ حیدر آباد پہنچ کر انیس بیمار ہو گئے۔ اسی بیماری میں انھوں نے مجلس پڑھی اور اس کے بعد ''تمامی مجلس کہ از امراء و اہلِ خلاف مملو بود، بر قدم اُفتادند'' [۱۸] اہلِ خلاف وہ لوگ تھے جو شیعہ عقیدے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ''ہر روز از ہفت ہشت ہزار آدم کم نہ بودند و حالِ مجلس روز نہم چہ نویسم۔ افسوس جائے شما خالی بود'' [۱۹]۔

Scanned with CamScanner

اپنی بیماری کی وجہ سے میر انیس اپنے قیام حیدر آباد سے لطف نہ اُٹھا سکے اور لکھا کہ ''ہر روز قاصد روانگی ازیں جا ہستم لیکن مرد ماں نہ می گذارند و مرا ہر ساعت برابر ہزار سال است واز ہمہ بیزارم..... می خواہم کہ زندہ ازیں شہر بیروں شوم۔ درراہ ہر چہ شود بہتر است۔ راہ نیز صعب و دشوار است و من چناں ناتواں ام کہ بیان آں نمی توانم کہ بکنم۔ تقدیر ہر جا ہم راہ است..... دعا نمایند کہ ازیں شہر نجات یابم و جان خود بہ سلامت برم'' [۲۰] آخر کار ۲۴ر محرم ۱۲۸۸ھ/ ۱۵ر اپریل ۱۸۷۱ء کو انیس حیدر آباد سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئے [۲۱] اور کم و بیش تین سال بعد ۱۸۷۴ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

میر انیس اپنے دور کی لکھنوی ثقافت کے نمائندہ انسان تھے۔ حد درجہ نازک مزاج اور معقول۔ شریف العلما نے ۱۶ر ذالحجہ ۱۲۸۷ھ کے خط میں ان کے بارے میں لکھا کہ ''مرد بسیار معقول و نہایت نازک مزاج ہستند'' [۲۲] لکھنوی انکسار بھی مزاج میں بہت تھا۔ ساتھ ہی عزت نفس اور خودداری، قناعت اور شکر ان کے مزاج کا حصہ تھے:

فقر کی دولت کو کیا خالق نے بخشا ہے وقار ہاتھ پھیلاتا ہے سلطاں بھی گدا کے سامنے
دی ہے جو خدا نے سرفرازی مجھ کو ثمرہ یہ نہال خاکساری کا ہے

طبیعت میں احتیاط بھی بہت تھی۔ حیدر آباد دکن کے قیام کے دوران جب وہ بیمار تھے، مختار الملک بہادر نے اپنے ہاں مجلس کا قصد کیا۔ انیس نے ضعف و سرفہ کے سبب انکار کر دیا۔ مختار الملک نے دربار میں کہا کہ ''رفتن ایشاں ازیں شہر قبول نہ دارم''۔ یہ جملہ سنا تو مونس کے نام اپنے خط میں لکھا کہ ''ایں خبر یا شنیدہ بر خود می لرزم کہ حاکم است۔ مکرر گفتہ فرستادہ ام کہ من جلد حاضر شدہ در ماہ شعبان ملازمت حاصل خواہم نمود کہ حالا بہ سبب عوارض گوناگوں طاقت نشستن نہ دارم'' [۲۳]۔

انیس خوش گفتار و خوش تقریر، خوش صفات و خوش اخلاق انسان تھے۔ دوستوں کی محفل میں کھل کر باتیں کرتے۔ ایک دفعہ میر صاحب تپ میں مبتلا تھے۔ مفتی میر عباس عیادت کو تشریف لائے۔ نبض دیکھ کر کہا کہ اب تو بخار ہلکا ہو گیا ہے۔ انیس نے کہا کہ مٹھی بھر ہڈیوں کی ناتوانی دیکھ کر ایسا خفیف ہو گیا ہے کہ شاید کم بخت اب منہ نہ دکھائے گا [۲۴]۔

ایک دفعہ ایک ملازم کو کسی کام کو بھیجا۔ وہ بہت دیر میں لوٹا اور بتایا کہ چوک سے ایک برات جا رہی تھی۔ اس کے دو اونٹ آپس میں لڑ رہے تھے، راستہ بند تھا۔ دیر ہو گئی۔ انیس مسکرائے اور کہا: صاف کیوں نہیں کہتے کہ جنگ جمل کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ [۲۵]

میر زادبیر نے صنعت مہملہ (بے نقط الفاظ کا استعمال) میں ایک مرثیہ کہا۔ کسی نے انیس سے اس کا ذکر کیا۔ میر صاحب بولے: تو یہ کہیے سر سے پاؤں تک مہمل ہے [۲۶] میر انیس بھی اہل لکھنؤ کی طرح رعایت لفظی کو پسند کرتے تھے کسی نے پوچھا کہ آپ رعایت لفظی کو اس قدر پسند کیوں کرتے ہیں۔ کہا کیا

کروں آخر لکھنؤ میں رہنا ہے [۲۷]۔

ایک نواب صاحب بولے میر انیس کے ہاں مرثیہ خوانی کی مشق کر رہے تھے۔ اتفاق سے کھجانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ضبط نہ کر سکے۔ دامن ہٹا کر پیٹ کھجانے لگے۔ میر صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کہا کہ مرثیہ رکھ دو اور اچھی طرح کھجالو۔ نواب صاحب نے معافی چاہی۔ میر انیس نے کہا: نہیں صاحب کھجایئے اور اچھی طرح کھجایئے۔ آپ نے مرثیہ کی تعلیم دُھرپد اور پٹے کی تعلیم سمجھی ہے کہ گاتے بھی جاتے ہیں اور کھجاتے بھی جاتے ہیں [۲۸]۔

میر انیس کے ہاں ایرادِ مضامین اور ضعیف روایتیں اکثر باندھی گئی ہیں۔ عظیم آباد (پٹنہ) میں مجلس تھی اور انیس پڑھ رہے تھے۔ ایک سخن شناس نے ان کا کلام سن کر اعتراض کیا کہ مرثیہ گویانِ لکھنؤ حضرات اہلِ بیت کا صبر و شکر نظم کرنے کے بجائے بعض اوقات ایسی باتیں نظم کرتے ہیں جو صبر و رضا کے بالکل منافی ہیں۔ انیسؔ نے کہا کہ ''جو صاحب معترض ہیں وہ دس بند ہی ایسے کہہ کر سنا دیں جن میں صحیح روایات سے مطلق تجاوز نہ ہو اور پھر کلام موثر و مبکی ہو'' [۲۹] مرثیہ کو مبکی و موثر بنانے کے لیے ہر مرثیہ گو روایت یا حدیث میں حسب ضرورت ترمیم کر لیتا ہے یا کوئی نئی روایت اپنے تخیل سے تراش لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موضوعِ کربلا اردو مرثیے کی ابتدا سے لے کر اب تک بدلتا رہا ہے۔

انیس بہت محنتی انسان تھے۔ مرثیہ کہتے تو دن رات محنت کر کے اس کی نوک پلک سنوارتے اور ایسی روانی، ایسا آہنگ پیدا کرتے کہ سننے والا مسحور ہو جاتا۔ انھوں نے مرثیے میں عام بول چال کی شستہ زبان اور محاورہ استعمال کیا ہے۔ جیسی محنت وہ مرثیہ کہنے پر کرتے تھے ویسی ہی محنت مرثیہ پڑھنے پر بھی کرتے تھے۔ مرثیہ خوانی میں بھی وہ اپنے وقت کے بڑے استاد تھے۔ دوسرے مرثیہ خواں فن مرثیہ خوانی سیکھنے اور مشق کرنے ان کے پاس آتے۔ مرثیہ تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ پڑھنے اور بتلانے میں انھیں یدطولیٰ حاصل تھا۔ آواز میں شیرینی و مٹھاس اور سخن و دل کشی تھی۔ لہجہ سبک اور تیز تھا [۳۰] بلند آواز سے مرثیہ پڑھتے تا کہ آواز سب تک پہنچ سکے۔ مرزا دبیر کی آواز بھاری اور مردانہ تھی ع ..... صد شکر کہ پڑھنا مرا مردانہ ہے۔ انیس اپنی آواز کو ع ..... میں باعثِ نغمہ سنجیٔ بلبل ہوں کہتے تھے۔ انیس اپنے موضوع اور مضمون کے مطابق آواز کے اُتار چڑھاؤ سے، آنکھوں اور ہاتھ کی حرکت اور چہرے کے تاثرات اور ''بتانے'' سے محفل کو گرماتے تھے۔ ادیب نے لکھا ہے کہ ''ایکٹنگ کا یہی کمال ہے جو میر انیس کو قدرت نے اور دوسروں کو میر انیس نے سکھایا۔ میر انیس منبر پر بیٹھ کر تحت اللفظ پڑھنے کے موجد تو نہ تھے لیکن ان سے پہلے تحت اللفظ خوانی کو فن کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ میر صاحب نے نہ صرف اس کو ایک مستقل فن بنا دیا بلکہ مرثیہ گوئی کی طرح مرثیہ خوانی کو بھی اس درجۂ کمال پر پہنچا دیا جس سے آگے بڑھنا ممکن نہ ہوا'' [۳۱] میر انیس کی مرثیہ خوانی پر نہ صرف داستان گویوں کے اثرات واضح تھے بلکہ اُن سے پہلے، دوسرے مرثیہ خوانوں کے انداز کی روایت بھی موجود تھی۔ انیس نے اس روایت کے

Scanned with CamScanner

اجزا اپنے مزاج میں شامل کر کے اسے ایسی دل کش و پر اثر صورت دی کہ اچھا مرثیہ، اچھا پڑھنے سے، تاثیر کے اعتبار سے دو آتشہ ہو گیا۔ ان کے مرثیے کے اصل جوہر مرثیہ سننے سے کھل جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ کہتے وقت انیس مرثیہ خوانی کے تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔

اس دور میں صنائع بدائع کا استعمال لکھنوی مزاج کی گھٹی میں پڑا تھا اسی لیے ہر شاعر ان سے اپنی شاعری کو سنوارتا تھا۔ انیس ان سے دوہرا کام لیتے ہیں۔ ایک طرف تہذیبی رواج کا پیٹ بھرتے ہیں اور ساتھ ہی ان سے مرثیہ خوانی میں تاثیر کا جادو جگاتے تھے۔ اس سے بقول نیر مسعود یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ''کلامِ انیس میں لفظی و معنوی صنائع بدائع کی کثرت کیوں ہے'' [۳۲] مرزا قادر بخش صابر دہلوی نے مرثیہ گوئی میں انیس کی فصاحت و بلاغت کو داد دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''تحت لفظ یعنی مرثیہ بغیر آہنگِ موسیقی کے ایسی طرز سے پڑھتا ہے گویا عنانِ اثر اُس کی صدائے دل سوز کے ہاتھ میں ہے'' [۳۳]۔

انیسویں صدی کا یہ دور لکھنؤ کی بہار کا آخری دور تھا۔ اس دور میں انیسؔ و دبیرؔ کا طوطی اسی طرح بول رہا تھا جس طرح ایک زمانے میں میر و سودا کا، مصحفی و جرأت و انشا کا یا ناسخ و آتش کا۔ مرثیے کا تعلق چونکہ مذہبی عقیدے سے تھا اور اس دور میں شیعیت لکھنؤ کی فضا پر چھائی ہوئی تھی اس لیے اس دور کے لکھنؤ میں دو گروہ باقاعدہ وجود میں آ گئے۔ ایک گروہ ''انیسیہ'' کہلایا اور دوسرا ''دبیریہ'' اور یہ دونوں گروہ اپنے اپنے ممدوح کو ہر طرح سے بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے لیکن انیس و دبیر کا مقابلہ شاعری کے میدان میں تھا۔ دونوں اپنے کلام میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور اگر چوٹ کرتے بھی تو زیادہ تر اشاروں میں اور وہ بھی اشعار کے پردے میں۔ اس کے برخلاف انیسیے دبیریے جھگڑے فساد سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے کہ ایک روز رمضان کے مہینے میں نماز جماعت کے لیے میاں تحسین علی خاں کی مسجد میں گیا تو دیکھا کہ نماز و وعظ کے بعد پانچ سو مومنین مسجد میں جمع ہیں اور میر انیس و میرزا دبیر کے شاگردوں اور مداحوں میں بحث ہو رہی ہے اور نوبت گالی گلوچ اور جوتی پیزار کی پہنچی ہے۔ انھوں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ قصہ کیا ہے تو انھوں نے ہنس کر ہر مرثیہ گو شیخ گوہر علی مشیر کا یہ شعر پڑھا:

قصہ عمر کا ہے نہ جناب امیر کا
بس جھگڑا رہ گیا ہے انیس و دبیر کا [۳۴]

اس دور میں انیسیوں دبیریوں کا یہ اکھاڑا نہ صرف سارے لکھنؤ میں جما ہوا تھا بلکہ سارے ہندوستان میں انیس و دبیر کے کلام کو پسند کرنے والے، مبالغے کے ساتھ اپنے اپنے ممدوح کی حمایت بڑھ چڑھ کر کرتے تھے۔ اس تعلق سے شاعروں نے ایک دوسرے پر چوٹیں کیں اور سب نے مزہ لیا۔ بے فکروں کے ہاتھ ایک تماشا آ گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انیس کے سلام کا یہ شعر اہلِ مجلس نے بہت پسند کیا۔ قافیہ دشوار تھا اور بے ساختگی سے نظم ہوا تھا۔ تمام شہر میں دھوم مچ گئی:

Scanned with CamScanner

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے چنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو

بادشاہِ وقت واجد علی شاہ اختر نے بھی اسی زمین میں غزل کہی اور آستینوں کا قافیہ باندھا۔ مرزا دبیر کے صاحب زادے اوج نے بھی اسی زمین میں سلام کہا۔ انیس کے چھوٹے بھائی میر مونس نے بھی سلام کہا جس میں یہ شعر بھی تھا:

بھلا تردد بے جا سے اس میں کیا حاصل اٹھا چکے ہیں زمیں دار جن زمینوں کو

میرزا دبیر کے شاگرد نواب ممتاز الدولہ اس مجلس میں موجود تھے۔ وہ اُٹھ کر چلے گئے۔ اس پر انیسیوں و دبیریوں میں شور مچ گیا۔ مرزا کے شاگرد ہر سیہ گو شیخ گوہر علی مشیر نے بے نقط سنائیں:

جلی کٹی مرے استاد سے کرے جو کوئی تو پھونک دوں مع خرمن میں خوشہ چینوں کو

ہزار بار سزا پا کے منھ پہ چڑھتے ہیں مشیر کیا کہوں ان احمق الازمینوں کو

اساتذہ کی ہیں غزلیں سلام بھی اکثر نیا سمجھتے ہیں پھر لوگ ان زمینوں کو [۳۵]

اسی صورتِ حال کا ذکر شاگردِ غالب قربان علی سالک نے جو ۱۸۶۱ء میں لکھنؤ آئے تھے اپنی بیاض میں ان الفاظ میں کیا ہے کہ ''دلّی میں مرزا غالب اور اُستاد ذوق کی چوٹیں دیکھتا سنتا تھا مگر یہاں میر انیس اور مرزا دبیر کی معرکہ آرائی کا عالم نرالا ہے۔ ایک طرف کا معتقد دوسری طرف والوں میں ایسے دیکھا جاتا ہے جیسے موحدین میں مشرک اور مسلمانوں میں کافر'' [۳۶]۔

یہ دور پوری طرح جاگیردارانہ نظام کی روایت میں جکڑا ہوا تھا۔ طبقۂ خواص سارے معاشرے پر چھایا ہوا تھا اور عوام کی حیثیت تنکے سے زیادہ نہیں تھی۔ اسی طبقے کی پسند اور مذاق اہمیت رکھتا تھا۔ یہی سکۂ رائج الوقت تھا۔ انیس زبان و بیان کی سطح پر اپنے عام فہم مرثیے اور مخصوص انداز سے مرثیہ پڑھنے کی وجہ سے مقبول تھے لیکن بحیثیت شاعر ان کی وہ حیثیت نہیں تھی جو مرزا دبیر کو حاصل تھی۔ امام بخش ناسخ اس تہذیب کا سب سے بڑا شاعر تھا جس کو سارا معاشرہ پسند کرتا تھا۔ یہ شاعری طبقۂ خواص کے دلوں کو آسودہ کر رہی تھی۔ اردو نثر میں ''فسانۂ عجائب'' سب سے بڑی نثری تخلیق سمجھی جاتی تھی اور طبقۂ خواص اس پر لہلوٹ تھا۔ اسی طرح میرزا دبیر کا مرثیہ بھی طبقۂ خواص کے دلوں کا پسندیدہ ترجمان تھا۔ اس کی مشکل پسندی، خیال بندی، مضمون آفرینی، مابعد الطبیعیاتی اندازِ فکر میں اُسے کلامِ ناسخ کی خوش بو آتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مرزا دبیر میر انیس سے بڑے مرثیہ گو تھے اور میر انیس کو یہی شکایت تھی جس کا اظہار انھوں نے اپنے مشہور مرثیے: ''یارب چمنِ نظم کو گل زارِ ارم کر'' کے کئی بندوں میں کیا ہے:

الماس سے بہتر یہ سمجھتے ہیں خذف کو دُر کو تو گھٹاتے ہیں بڑھاتے ہیں صدف کو

اندھیر یہ ہے چاند بتاتے ہیں کلف کو کھو دیتے ہیں شیشے کے لیے دُرِ نجف کو

صنائع ہیں دُر و لعلِ بدخشان و عدن کے مٹی میں ملاتے ہیں جواہر کو سخن کے

Scanned with CamScanner

اور پھر اپنے کلام کی خصوصیات اور خوبیوں کو بیان کر کے اہلِ نظر کو اسے دیکھنے پرکھنے کی دعوت دیتے ہیں:

ہے لعل و گوہر سے یہ دہن کانِ جواہر — ہنگام سخن کھلتی ہے دکانِ جواہر
ہیں بند مرصع تو ورق خوانِ جواہر — دیکھے اسے، ہاں ہے کوئی، خواہانِ جواہر
بینائے رقوماتِ ہنر چاہیے اس کو — سودا ہے جواہر کا نظر چاہیے اس کو

محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' لکھی تو انیس سے پہلے مرزا دبیر کا مطالعہ کر کے دبیر کو انیس پر فوقیت دی، لیکن جب اودھ میں شاہی ختم ہوئی اور انگریزی اقتدار کے ساتھ انگریزی زبان و ادب کے نئے رجحانات سامنے آئے تو ''نیچرل شاعری'' کی تلاش شروع ہوئی اور اہلِ نظر کی نظر کلامِ انیس پر پڑی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میر انیس اوپر آ گئے اور میرزا دبیر ان کے بعد دکھائی دینے لگے۔ مولانا شبلی نعمانی نے ''موازنۂ انیس و دبیر'' میں جدید دور کے نئے رجحانات اور تقاضوں کو انیس کے کلام میں دیکھ کر انیس کو اولیت کا درجہ دیا۔ یاد رہے کہ دلّی میں اسی زمانے میں ذوق کا نام غالب سے پہلے آتا تھا لیکن شاہی کے خاتمے کے ساتھ جب نئے تہذیبی تقاضوں نے مقبولیت حاصل کی تو غالب کا نام ذوق سے پہلے لیا جانے لگا۔ آج بھی غالب کا نام نہ صرف ذوق سے پہلے آتا ہے بلکہ غالب ہی آج سارے دور اور سارے ادب پر چھائے ہوئے ہیں۔ نئے تقاضوں اور نئے مذاق کے ساتھ اسی طرح روایت بدلتی ہے اور شاعروں ادیبوں کے مرتبے بھی اسی کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ جو شاعر یا ادیب آنے والے زمانوں کا ساتھ دیتا ہے وہ اُبھر کر سامنے آ جاتا ہے اور جو صرف اپنے دور میں محصور رہتا ہے وہ وہیں سکڑ کر رہ جاتا ہے۔ ادب اور انسانی فکر کی تاریخ ہمیں یہی سکھاتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ میر انیس کا تہذیبی مزاج بھی اُن کے مرثیوں کے مطالعے کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کر رہے تھے جس کے رنگ و مزاج سے وہ پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ لکھنؤ کا ماحول اور اس کی تہذیبی فضا ان کے باطنی وجود کا حصہ تھے۔ یہاں کے رسوم و رواج، رکھ رکھاؤ اور عقیدہ پر وہ اس حد تک یقین رکھتے تھے کہ مرثیے میں آلِ رسول ﷺ کو ان سے وابستہ کرتے ہوئے انھیں ذرا جھجک نہیں ہوتی۔ لکھنؤ انگریزی حفاظت میں آ کر ہر قسم کے ہنگامے فساد سے محفوظ ہو گیا تھا۔ اب نواب وزیر کے پاس کرنے کے لیے کچھ رہ بھی نہیں گیا تھا۔ آصف الدولہ کو اس پرامن ماحول میں رنگا رنگ سرگرمیاں بڑھانے کا پورا موقع ملا۔ محرم کی سرگرمیاں اور بات بات پر رسومات کو تہواروں کی صورت دینا یہاں کے شاہوں، نوابوں، امیروں کا مشغلہ بن گیا تھا۔ واجد علی شاہ تک آتے آتے آصف الدولہ کے قائم کیے ہوئے سماجی و تہذیبی نظام کو ایسا استحکام ہو گیا کہ لکھنؤ والے خود کو بھی اس ''مثالی تہذیب'' کے مثالی نمائندے سمجھنے لگے تھے۔ اس صورت میں وہ یہ تصور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ حضرت امام حسین کا اخلاق ان کے اخلاق سے مختلف ہو سکتا ہے بلکہ وہ تو اسی تہذیب کے مثالی نمائندے تھے۔ میر انیس نے اس صورتِ حال میں اس پر غور ہی نہیں کیا کہ ان کے شہر کی تہذیب اور اس کے اخلاق میں کسی تبدیلی کی ضرورت بھی ہے۔ ایک

Scanned with CamScanner

طرف عیش و نشاط کی دنیا تھی اور ساتھ ہی مذہبی رسوم کی دنیا تھی جس میں عام مذہب رچا ہوا تھا۔

اس دور کے اودھ کی تہذیب کو زوال پذیر تہذیب کہا جاتا ہے۔ وہ سیاسی اعتبار سے یقیناً زوال پذیر تھی لیکن اصل میں اسے شیعہ مذہب کی نشاۃ الثانیہ کہنا چاہیے۔ اسی لیے اس معاشرے کا فرد کسی الجھن کا شکار نہیں ہے۔ میر انیس بھی اسی لیے اپنے مجلسیوں کی شان دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور جو بات کہتے ہیں اس میں ان کی ذہنی سطح کا خیال رکھتے ہیں اور ان کے جذبات کو تسکین بہم پہنچانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس تہذیبی ماحول اور مرثیے کے مزاج کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ لکھنوی مذہب ترکِ دنیا سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رکھتا ہے۔ حضرت امام حسین کو مظلوم جاننا اور ان کی مظلومی پر آنسو بہانے کو ثواب سمجھنا ترکِ دنیا کا راستہ ہے۔ میر انیس ان جذبات کو بے چون و چرا اپنے مراثی میں باندھتے ہیں۔ سکون اور ٹھہراؤ کے عالم میں آیا ہوا یہ معاشرہ انیسؔ کو دم توڑتا ہوا نظر نہیں آتا بلکہ دائمی حیثیت کا حامل نظر آتا ہے۔ وہ زمانے سے لڑتے نہیں ہیں بلکہ اسے قبول کر کے اس جیسے ہو جاتے ہیں اور اسی لیے ان کا مرثیہ فکری و اخلاقی سطح پر اپنے دور میں محصور ہے۔ میر انیسؔ بھی دوسرے فنون کے عاملوں کی طرح، اپنے ''فن'' کو بہتر سے بہتر بنانے میں منہمک رہتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ع..... ''پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری''۔ انیس مفکر نہیں بلکہ فن کار ہیں اور اپنے فن کو کمال کے درجے پر پہنچانا، ان کا اصل کام ہے۔ مرثیے کا فن ان کے ہاتھوں کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ وہ روایت سے بغاوت یا انحراف نہیں کرتے بلکہ روایت کو دل سے مانتے ہوئے اس فن کے باقی امکانات کو، اپنی فطری خداداد صلاحیت اور ریاضت سے، اپنے تصرف میں لا کر اسے کمال نفاست تک پہنچا دیتے ہیں اور فن، ہیئت اور تکنیک کی دنیا میں آ جاتے ہیں۔ یہی ان کا کارنامہ ہے۔

مطالعہ شاعری: مرثیہ

مفتی میر محمد عباس شوستری نے اپنی مثنوی ''من وسلویٰ'' میر انیس کو بھیجی تو ان کی نظر اس مثنوی کی ان خصوصیات پر پڑی جو ان کے خیال میں کسی شعری تخلیق میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے لکھا کہ ''دریں جزو زبان طرز اعجاز طرازی وسحر پردازی برذاتِ فیض آیات ختم گرویدہ'' [۳۷] انیس کے نزدیک ''زبان'' اور ''طرز اعجاز طرازی وسحر پردازی'' ہی وہ خصوصیات ہیں جن سے شاعر کا کمال سامنے آتا ہے۔ یہی معیار انیس نے اپنی شاعری میں پیدا کیا اور یہی وہ پہلو ہے جس سے ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

غور سے دیکھیے تو سخن کی وہ روایت جو ولیؔ دکنی سے لے کر میر انیس تک پہنچی اس میں طرز ادا سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جس میں زبان کو صحت کے ساتھ استعمال کرنا، اس میں مناسب رنگ بھرنا اور سحر بیانی تک پہنچ جانا شاعری کا اصل معیار ہے۔ اس طرح فصاحت و بلاغت کے تمام اصولوں کو خوبی سے شاعری میں

Scanned with CamScanner

برتا غربی و فارسی کی طرح اردو شاعری کا بھی معیار قرار پایا۔ خود انیس کے دادا میر حسن نے اپنی مثنوی ''سحر البیان'' میں طرز ادا کو ایک نقطۂ عروج تک پہنچا دیا تھا۔ میر انیس نے اپنی شاعری میں اسی ''طرز اعجاز طرازی'' کی تکمیل کی۔ یہاں خیال یا مضمون سے زیادہ ہر جگہ زبان و بیان اور طرز ادا پر زور نمایاں ہے۔ مثلاً انیس کے مرثیے کا یہ بند دیکھیے جو اسی مزاج کی ترجمانی کرتا ہے:

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملادوں قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملادوں
ذرّے کی چمک مہر منور سے ملادوں خاروں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملادوں
گل دستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنا، یہی انیس کا فن ہے اور یہی فن اردو شاعری کی اصل روایت ہے جس میں وہ مبالغہ آمیز ادراک بھی شامل ہے جو عربی و فارسی شاعری سے اردو شاعری کو میراث میں ملا ہے۔ شاعری کی اسی روایت کو میر انیس کمال تک پہنچا دیتے ہیں۔

انیس نے اس طرز ادا کو برتتے ہوئے اپنے مرثیے میں فطری جذبات کا اظہار بھی کیا ہے۔ کہیں باغ و راغ کے مناظر پیش کیے ہیں اور کہیں انسانی جذبات کی تصویریں اتاری ہیں۔ ایسی تصویریں ''سحر البیان'' میں بھی ملتی ہیں لیکن انیس کے ہاں وہ زیادہ نکھر کر سامنے آتی ہیں۔ شبلی نعمانی جب نیچرل شاعری کی تلاش میں نکلے تو اس کے نمونے انھیں میر انیس کے ہاں نظر آئے۔ ''موازنہ انیس و دبیر'' اسی تلاش کا مدلل اظہار ہے۔ الطاف حسین حالی، جو جدید نظم کے موجدوں میں شمار ہوتے ہیں، نیچرل و قومی شاعری کی طرف آئے تو انیس کے مرثیوں نے انھیں ایک نیا راستہ دکھایا اور انھوں نے اپنی مشہور زمانہ مسدس (مدوجزر اسلام) مرثیے کی ہیئت اور اسی رنگ میں لکھی۔ اس طرح جدید نظم پر نظیر اکبر آبادی کی طرح انیس کے مرثیے کا اثر بھی نمایاں ہے۔ غور سے دیکھیے تو اردو شاعری کی روایت اور مرثیے کی مخصوص روایت میں میر انیس ایک عمل انگیز عامل (CATALYTIC Agent) کی طرح موجود ہیں اور اسے ایک نیا موڑ دیتے ہیں۔ یہی وہ پہلو ہے جو جدید نظم کے بانیوں کو انیس کے مرثیے میں نظر آیا اور جسے شبلی نے ''موازنہ'' میں اور حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں سراہا اور نمایاں کیا ہے۔

میر انیس نے اپنے چند مرثیوں کے چہرے میں اپنے فن کے اغراض و مقاصد کا اظہار کیا ہے۔ ان چہروں کے مطالعے سے وہ تصورِ شاعری (بوطیقا) سامنے آتی ہے جس پر چل کر انھوں نے اپنے مرثیے کو بنا اور سنوار کر اپنی انفرادیت کی مہر ثبت کی ہے۔ ذیل کے چار مرثیے خاص طور پر ایسے ہیں جن سے انیس کا تصورِ شاعری واضح ہو کر سامنے آتا ہے:

۱۔ ع ــــ یارب چمنِ نظم کو گلزار بنا دے
۲۔ ع ــــ نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری

Scanned with CamScanner

۳۔ ع ...... رطب اللساں ہوں مدحِ شہِ خاص و عام میں

۴۔ ع ...... اے شمعِ قلم روشنی طور دکھا دے

میر انیس کے مطابق شاعری میں حسنِ بیان سے پیدا ہونے والی ایسی رنگینی و سلاست ہونی چاہیے جو فصاحت و بلاغت کے اصولوں پر پوری اُترے۔ شاعری مغلق اور گنجلک نہ ہو اور لفظوں کی ترتیب تعقید سے پاک ہو۔ لفظوں سے رزم و بزم کے ایسے مرقع بنائے جائیں جس میں سایہ و نور ساتھ نظر آئیں اور ایسی تصویریں اُتاری جائیں کہ شمع تصویر پر پتنگے آ آ کر گرنے لگیں اور تیغوں کی آنکھوں میں بجلیاں چمک جائیں۔ شعر کی زبان میں شرفا کا روزمرہ استعمال کیا جائے۔ بیان اور اس کا لب و لہجہ موقع و محل کے عین مطابق ہو۔ اظہار میں سلاست و متانت ہو اور صنعت کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ سامعین اُسے جلد سمجھ سکیں۔ الفاظ چست اور مضامین عالی ہوں۔ سہل ممتنع شاعری کا حسن ہے۔ جب مرثیہ لکھا جائے تو وہ درد سے خالی نہ ہو۔ اس میں دبدبہ بھی ہو اور مصائب کا بیان بھی۔ مدح و توصیف بھی ایسی ہو جسے سن کر شاعری سے دل محظوظ ہو سکے۔ مرثیے میں رونے کی تاثیر کا ہونا ضروری ہے۔ یہی اثر جانِ مرثیہ ہے۔ ان سب خصوصیات کو حسبِ ضرورت استعمال کرنے کے لیے ''ریاضت'' کی ضرورت ہے اور ریاضت فنِ شاعری کی جان ہے۔ میر انیس نے اسی معیار کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی شاعری کو عروجِ کمال تک پہنچایا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہر صنفِ شاعری کچھ مخصوص جذبات و مقاصد کے اظہار کے لیے وجود میں آتی ہے۔ مرثیہ ثواب حاصل کرنے کے لیے غم و اندوہ اور بکا کے جذبات کو ابھارنے کا ذریعہ ہے۔ مرثیے کو ادبی رنگ دینے کے لیے شعرا نے اس میں اردو و فارسی ادب کی اصناف کی خصوصیات شامل کی ہیں۔ اس میں قصیدہ و مثنوی کا مزاج بھی شامل کیا ہے اور وہ مبالغہ آمیز ادراک بھی جو عربی فارسی اردو شاعری کا عام ادراک ہے۔ ان اثرات کے باعث قصیدے کی تشبیب مرثیے کا ''چہرہ'' بن گئی۔ مدح، حضرت امام حسین اور ان کے انصار کی مدح بن گئی۔ ممدوح کے گھوڑے اور تلوار کی تعریف بھی جزوِ مرثیہ بن گئی۔ اسی طرح مختلف روایات کے شامل ہونے سے مثنوی کی طرح مرثیہ میں بھی ''کہانی پن'' پیدا ہو گیا۔ کہانی پن سے دلچسپی پیدا ہوئی اور مزید دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ضعیف روایات و احادیث کو بھی موضوعِ مرثیہ بنا لیا گیا۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ ''بعض ضعیف روایتیں اور دل خراش مضامین ایسے نظم ہو گئے ہیں جو مناسب نہ تھے'' [۳۸]۔ آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''تعریف کی بنیاد گریہ و بکا اور لطفِ سخن اور ایجادِ مضامین پر ہوتی تھی۔ کمال یہ تھا کہ سب کو رلانا اور سب کے منہ سے تحسین کا نکالنا۔ اسی شوق کے جذبے اور فکرِ ایجاد کی محویت میں جو کچھ قلم سے نکل جائے تعجب نہیں'' [۳۹]۔ حامد حسن قادری نے لکھا ہے کہ ''بیاناتِ مرثیہ کی تاریخی وقعت کچھ نہیں ہے نہ اس حیثیت سے مرثیہ کو کبھی دیکھا گیا ہے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ جہلا اور عوام الناس مرثیے کے ایک ایک واقعہ و روایت کو تاریخ کیا آیت و حدیث سمجھتے ہیں اور یہی مرثیہ گویوں کا مقصد تھا'' [۴۰]۔ یہی وجہ ہے کہ میر انیس کے

Scanned with CamScanner

مرثیوں میں بین کے لیے جو غلط واقعات اور ضعیف روایات شامل مرثیہ کی گئی تھیں آج شیعہ فکر و مذہب کا حصہ بن گئی ہیں۔ جب عظیم آباد میں مرثیہ پڑھتے ہوئے اہلِ مجلس میں سے کسی نے ضعیف روایت پر اعتراض کیا تو میر انیس نے اعتراف کرتے ہوئے جواب دیا کہ ''جو صاحب معترض ہیں وہ دس بند ہی ایسے کہہ کر سنا دیں جن میں صحیح روایات سے مطلق تجاوز نہ ہو اور پھر کلام موثر و مسکی ہو'' [۴۱]۔

منظر نگاری، مناظر قدرت، سراپا وغیرہ بھی قصیدے، مثنوی اور واسوخت سے شامل ہو کر مرثیے کا جزو بن گئے۔ اس طرح مرثیہ اردو شاعری کی روایت سے پوری طرح منسلک ہو گیا۔ اسی کے ساتھ مرثیہ کا سارا زور زبان و بیان اور طرز ادا پر ہو گیا۔ میر انیس نے یہ سب کام پوری طرح ایسے سلیقے سے کیے کہ ان کا مرثیہ اپنے زمانے میں مقبولیت کے بلند مقام پر پہنچ گیا۔ میر ضمیر نے اپنے مراثی میں مرثیے کے اجزاءِ ترکیبی کی ابتدائی صورت متعین کر کے اس کی ہیئت کو ایک صورت دی تھی۔ میر انیس نے اس ہیئت کو سارے اجزائے ترکیبی کے ساتھ اپنے تصرف میں لا کر مرثیہ کی داخلی و خارجی ہیئت متعین کر دی۔ مدح امام و انصار ہمیشہ کے لیے جزوِ مرثیہ بن گئی۔ میر انیس کے مراثی میں ''سراپا'' کے ذیل میں امام حسین کی آنکھ، چہرہ اور اعضائے جسمانی کی جس انداز سے مدح کی گئی ہے وہ، طرزِ ادا اور رنگِ سخن کی سطح پر، قصیدہ، مثنوی اور واسوخت ہی کا نیا رُوپ ہے۔ یہ رنگِ سخن مداحی کا رنگ ہے اسے حقیقت نگاری نہیں کہہ سکتے۔ حقیقت نگاری میر انیس کے تصورِ شاعری (بوطیقا) میں شامل نہیں ہے۔ مدح کے بعد یہی رنگ بزم و رزم میں بھی نظر آتا ہے۔ بیانِ ''بزم'' کے لیے میر انیس یہ دعا کرتے ہیں:

گر بزم کی جانب ہو توجہ دمِ تحریر — کھنچ جائے ابھی گلشنِ فردوس کی تصویر
دیکھے نہ کبھی صحبتِ انجم، فلکِ پیر — ہو جائے ہوا بزمِ سلیماں کی بھی توقیر
یوں تختِ حسینانِ معانی اُتر آئے — ہر چشم کو پریوں کا اکھاڑا نظر آئے

بزم کے بیان میں زیادہ تر اصحاب کے رخصت ہونے کے حالات پیش کیے جاتے ہیں یا پھر امام حسین کی شہادت پر حضرت زینبؓ کے ''بین'' کو بھی بزم کے دائرے میں لایا جا سکتا ہے۔ مرثیہ ''یارب چمنِ نظم کو گلزار ارم کر'' میں امام کی ولادت کا بیان، رسول اللہ ﷺ اور حضرت فاطمہ کی باہم گفتگو وغیرہ بھی بزم کے ذیل میں آتی ہے۔ امام کا مدینے سے سفر، حضرت زینب کا محلہ والیوں سے رخصت ہونا، عون و محمد کا علم کے لیے بحث و تکرار کرنا، یہ سب چیزیں جو بظاہر ڈراما جیسی معلوم ہوتی ہیں اور جن میں مکالمے آتے ہیں، بزم میں شمار ہوتی ہیں مثلاً حضرت عباس میدانِ جنگ سے جانے کے لیے رخصت طلب کرتے ہیں کیوں کہ انھیں معلوم ہے کہ امام آسانی سے اجازت نہ دیں گے، وہ یہ انداز اختیار کرتے ہیں:

واللہ کہ قاسم کی بھی تقدیر تھی کیا خوب — سامان وہی ہو گیا جو تھا انھیں مطلوب
سرسبز ہوا سیدِ مسموم کا محبوب — اک ہم ہیں کہ بہنوں سے نجل بھائی سے مجوب

منھ زینبِ ناشاد کو دکھلا نہیں سکتے بھاوج کے بھی پُرسے کے لیے جا نہیں سکتے

پھر امام اور حضرت عباس کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے۔ عباس رونے لگتے ہیں اور امام اجازت دے دیتے ہیں۔ حضرت امام اور حضرت عباس دونوں خیمے میں جاتے ہیں۔ حضرت زینب سمجھاتی ہیں لیکن حضرت عباس نہیں مانتے۔ حضرت سکینہ کو بیدار کیا جاتا ہے کہ وہ چچا کو سمجھائیں مگر وہ پانی کا سوال کرتی ہیں۔ حضرت عباس مشک طلب کرتے ہیں اور پانی کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ انیس امام حسین سے متعلق مرثیے کے خاتمے پر حضرت زینب کو خیمے سے نکل کر بین کرتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ حضرت امام حسین خود اکثر جذباتی عالم میں آجاتے ہیں مثلاً حضرت عباس کے غم میں ان کی حالت زار دیکھیے:

سنتے ہی اس صدا کو شکستہ ہوئی کمر تڑپے اُٹھے مگر نہ سنبھالا گیا جگر
کانپے جو پاؤں تھام لیا بازوئے پسر چلاتے تھے کہو علی اکبر چلیں کدھر

خورشید کیوں چھپا ہے یہ کیا واردات ہے
کچھ سوجھتا نہیں ہمیں دن ہے کہ رات ہے

ڈاکٹر احسن فاروقی نے لکھا ہے [۴۲] کہ اس تمام بزم نگاری کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ میر انیس کربلا کے ہنگام کو فراموش کر کے لکھنؤ والوں کی جذباتی باتیں رقم کر رہے ہیں۔ اس پر اکثر یہ اعتراض کیا گیا کہ اہلِ بیت کو لکھنؤ کے عام لوگوں کی طرح دکھانا ''بدعت'' ہے۔ دوسروں نے اسے ڈرامائی عنصر کا نام دیا۔ اگر ڈرامے کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بقول ڈاکٹر فاروقی یہ سب باتیں فرضی اور غیر واقعیاتی ہیں۔ دراصل یہ سب باتیں مجلسیوں کی ضرورت و ذہنیت کو دیکھ کر رقم کی گئی ہیں تاکہ مبکی اثر پیدا ہو۔ مرثیہ نگار کا مقصد گداز پیدا کرنا اور رُلانا تھا اسی لیے میر انیس لکھنوی زندگی کی مانوس جھلکیاں دکھا کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مجلس سے ہٹ کر جب ہم ان باتوں کو پڑھتے ہیں تو وہ طول بیانی معلوم ہوتی ہیں۔ محمد حسین آزاد نے انیس کے مطالعہ میں لکھا ہے کہ ''اقلیم سخن میں جو دائرہ ان کے زیر قلم تھا ان کے جوشِ طبع میں اس کا بہت سا حصہ سخن آرائی اور رزم و بزم نے دبا لیا۔ مرثیت کا میدان بہت تنگ رہ گیا اور افسوس کہ اصل مدعا ان کا وہی تھا جسے آپ کھو بیٹھے'' [۴۳]۔

جہاں تک رزم کا تعلق ہے میر انیس کی مناجات و دعا یہ ہے:

آؤں طرفِ رزم ابھی چھوڑ کے جب بزم خیبر کی خبر لائے مری طبع اولوالعزم
قطع سرِ اعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم دکھلائے یہیں سب کو زباں معرکۂ رزم
جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

شاعری کی یہ روایتِ رزم فردوسی کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔ میر انیس نے اس روایت کو بھی برتا ہے۔ اس تعلق سے شبلی نعمانی ہنگامۂ جنگ، نقارۂ وغا، فوج کی تیاری، سپاہیوں کی آمادگی، جنگ کا آغاز، حملہ کی شدت،

Scanned with CamScanner

فوجوں کی ہل چل، دو حریفوں کی جنگ کی مثالیں دیتے ہیں۔ رزم کے بیان میں تلوار اور گھوڑے کی تعریف کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں شاعر کو اپنی طبع کے جوہر دکھانے اور تخیل کی پرواز کا اثر قائم کرنے کا بڑا موقع ہاتھ آتا ہے۔ مثال کے طور پر "تلوار" کی تعریف میں میر انیس کے یہ دو بند دیکھیے:

چمکی گری اٹھی اِدھر آئی اُدھر گئی — خالی کیے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی — ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اُتر گئی
اک شور تھا یہ کیا ہے جو قہر صمد نہیں
ایسا تو رودِ نیل میں بھی جزر و مد نہیں

بجلی گری کہ فوج پہ تیغ دوسر گری — کٹ کر کسی کی تیغ کسی کی سپر گری
چمکی کبھی فلک پہ کبھی فرق پر گری — سرکاٹ کر اُدھر سے جو اٹھی اِدھر گری
زرہیں تنوں میں مثلِ کفن چاک ہو گئیں
اک آن میں صفیں کی صفیں خاک ہو گئیں

اور ساتھ ہی گھوڑے کی تعریف میں یہ دو بند پڑھیے:

سمٹا جدا اُڑا اِدھر آیا اُدھر گیا — چمکا پھرا جمال دکھایا ٹھہر گیا
تیروں سے اڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا — برہم کیا صفوں کو، پرے سے گذر گیا
گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کے فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

آہو کی جست، شیر کی آمد، پری کی چال — کبک دری خجل، دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال — اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال
جو آگیا قدم کے تلے گرد بُرد تھا
چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوا بھی گرد تھا

غرض مرثیوں میں رزم کے آداب کو اس خوبی سے برتا گیا ہے اور میر انیس نے اپنی انفرادیت کی مہر اس طرح ثبت کر دی ہے کہ یہ سب بیانات، جو نہایت درجہ مبالغے کے ساتھ بیان کیے جاتے تھے اور جن کے کمال کی مثال مرزا دبیر کے ہاں ملتی ہے، میر انیس کے ہاں ایک حد تک نیچرل سے نظر آنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا شبلی جب انیس و دبیر کا مقابلہ کرتے ہیں تو میر انیس کے بیانات کو قدرتی اور مرزا دبیر کے بیانات کو طلسماتی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کی بھی یہی رائے ہے کہ دونوں دو راز قیاس اور طلسماتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ مرزا دبیر کا طرز مابعد الطبیعیاتی تصورات سے بھرا ہے اور میر انیس کا طرز قدرے "اصلیت" لیے ہوئے ہے۔ اس رزم نگاری کا انگریزی زبان کی صنف شاعری ایپک (EPIC) سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میر انیس

Scanned with CamScanner

مرثیے میں ان تمام پہلوؤں کو برت کر اپنے طرزِ ادا سے، جو اُن کا معیارِ شاعری ہے، ایک ایسا روپ دیتے ہیں کہ اس میں علم بیان و معنی کے زیرِ اثر فصاحت و بلاغت کا دلکش رنگ اُجاگر ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ طرزِ ادا ایک طرف ان کے مرثیوں کو کمال پر لے جاتا ہے اور ساتھ ہی وہ جدید اردو شاعری کے نیچرل رنگ سے بھی آملتا ہے۔

میر انیس ان شاعروں میں ہیں جن کے ہاں ''فن'' تمام تر اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ شبلی نعمانی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' میں فصاحت و بلاغت کے اصولوں کی وضاحت کر کے اور ان کی مثالیں میر انیسؒ کے کلام سے دے کر بتایا ہے کہ ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے اصولوں پر پورا اترتا ہے۔ وہ صنائع بدائع کو بھی اس بے ساختگی سے استعمال کرتے ہیں کہ حسنِ شعر بڑھ جاتا ہے۔ زبان کو جس صحت کے ساتھ انھوں نے استعمال کیا ہے ان کے معاصرین میں سے کوئی بھی ان سے آگے نہیں جاتا۔ قدرت و صحت زبان، روز مرہ و محاورہ کا برمحل استعمال، طرز ادا کی بے ساختگی و رنگینی میں ان کا کوئی نظیر نہیں ہے لیکن ان خصوصیات کو بیان کرنے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میر انیس کا انفرادی طرز کیا ہے؟ ڈاکٹر احسن فاروقی نے انیسؔ کی امتیازی و انفرادی صفت ''مصوری'' تلاش کی ہے۔ میری رائے میں انیس کا طرز ادا بھی اسی رجحان کا آئینہ دار ہے۔ مصوری ان کے طرز میں ایسا آہنگ پیدا کرتی ہے کہ ان کی شاعری اُن کے کمالِ فن کا اظہار ہو جاتی ہے۔

میر انیس کا طرز ادا کئی خصوصیات سے مل کر بنا ہے۔ ان میں سے ایک معیارِ زبان ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے اپنی شاعری میں عوام کی زبان استعمال کی ہے۔ میر انیس، پوری احتیاط کے ساتھ، شرفاء کی زبان اور ان کا روز مرہ و محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ یہی ان کا معیارِ زبان ہے: ع ..... روز مرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی۔ اردو ان کے گھر کی زبان تھی۔ ان کی چار پشتیں اسی زبان کو اپنی شاعری میں استعمال کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انیس کی زبان خود معیارِ زبان بن گئی۔ وہ شاعری میں مغلق و گنجلک الفاظ استعمال نہیں کرتے: ع ..... لفظ مغلق نہ ہو، گنجلک نہ ہو، تعقید نہ ہو۔ بات یا خیال کو وہ اس صفائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ خود ان کا شعر اس خیال کا آئینہ بن جاتا ہے: ع ..... ہر جا ہے ملکِ نظم میں نظم و نسق مرا۔ شعر میں آنے والے موزوں و چست الفاظ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ وہ تعقید سے پاک رہتا ہے: ع ..... لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے۔ وہ موقع و محل کے مطابق لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں: ع ..... یعنی موقع ہو جہاں جس کا، عبارت ہو وہی۔ انیسؔ فصاحت و بلاغت اور سلاست و متانت سے اپنے طرز کو نکھارتے ہیں: ع ..... یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال۔ ان کا زور اس بات پر ہوتا ہے کہ شعر ایسی زبان میں کہا جائے کہ جسے سنتے ہی سامعین سمجھ سکیں: ع ..... سامعین جلد سمجھ لیں جسے، صنعت ہو وہی۔ انیس کا کلام پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ناسخ و مرزا دبیر کے لہجے کے مردانہ پن کے برخلاف ان کے لہجے میں شیرینی، شائستگی اور نسائیت ہے۔ یہ فرق اس وقت زیادہ محسوس ہوگا جب انیس و دبیر دونوں کو ایک ساتھ پڑھا جائے۔ لہجے کی شیرینی کو محسوس

Scanned with CamScanner

کرنے کے لیے مثلاً یہ بند پڑھیے۔ حضرت زینب کہتی ہیں:

اماں کی وصیت کو بجالاؤں نہ کیوں کر — گھر بھائی سے تھا بھائی نہ ہوگا تو کہاں گھر
دو بہنیں ہیں ماں جائیاں اور ایک برادر — رسی سے بندھے ہاتھ کہ بلوے میں کھلے سر

جو ہوئے سو، بھائی کے ہمراہ ہے زینب
اس کوچ کے انجام سے آگاہ ہے زینب

انیس کے مراثی کو دیکھیے تو نسائیت والا یہی لہجہ حضرت علی اکبر اور حضرت امام حسین اور تمام مرد حضرات کا بھی رہتا ہے اور مراثی پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دماغ مٹھائی کھا رہا ہے۔ یہی مٹھاس ان کے طرز ادا کی خصوصیت ہے۔ حضرت امام حسین فرماتے ہیں:

یعقوب کے آگے جو پسر برچھی کو کھاتا — ہے دل کو یقیں منھ سے کلیجہ نکل آتا
فرزند کا دکھ باپ سے دیکھا نہیں جاتا — اکبر سے پسر کو کوئی ہاتھوں سے گنواتا

ہوتا ہے قلق گل ہو اگر خار کے نیچے
رکھے تو کلیجہ کوئی تلوار کے نیچے

غیروں کے لیے اپنی کمائی کو کوئی کھوئے — دل باپ کا مانے کہ پسر قبر میں سوئے
خوں میں کوئی اپنے دُر یکتا کو ڈبوئے — فرزند جواں قتل ہو اور باپ نہ روئے

فرزند کا غم بانوئے ناشاد سے پوچھو
یہ درد کسی صاحبِ اولاد سے پوچھو

اسی کے ساتھ سلاست زبان ان کے طرز ادا کا جزو اعظم ہے۔ اسی سے سہل ممتنع پیدا ہوتا ہے جو کمالِ فصاحت ہے اور یہ رنگ کثرت سے کلام انیس میں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیچرل شاعری کے مبلغین جب اس طرز کی تلاش میں نکلے تو وہ انھیں میر انیس کے ہاں ملا۔ قدرتی رنگ اُن کے ہاں قدرتی ضرور ہے لیکن پھر بھی شعوری ہے۔ ان کی سادگی بھی سوچی سمجھی ہے۔ وہ اشعار کو بے ساختہ بنانے کے لیے بڑا ریاض کرتے ہیں۔ اپنے فن کو سنوارنے میں ان کی محویت مشہور ہے۔ انیس اپنے طرزِ ادا میں صنائع کو اس طرح آسان بنا کر پیش کرتے ہیں کہ سننے والا اس سے لطف اُٹھا سکے۔ زبان کو بھی وہ آسان رکھتے ہیں تا کہ سنتے ہی وہ سامع کے دل میں اُتر جائے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جسے حالی نیچرل کہتے ہیں۔ انیس ذرا سی بات کو پھیلا کر بیان کرتے ہیں اور ایک پھول کا مضمون سو رنگ سے باندھتے ہیں۔ یہ طرز ادا کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مضمون باندھنے کے فن سے مختلف طرز ادا ہے اور مسکی اثر پیدا کرنے کے لیے ضروری بھی ہے جس کی وہ دعا مانگتے اور کوشش کرتے ہیں: ع — نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یارب۔

انیس کے کسی بند یا کسی مصرع کو لیجیے، اس میں لفظوں کی ترتیب اور رکھ رکھاؤ سے پیدا ہونے والی

Scanned with CamScanner

ہم آہنگی ملے گی جو شعوری طور پر پیدا کی گئی ہے اور جس سے بے ساختگی و روانی پیدا ہو کر اثر و تاثیر کو بڑھا دیتی ہے۔ ہر لفظ، ہر مصرع مشابہت اور تضاد کے لحاظ سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ ہر جگہ معنی اور آواز کا آہنگ موجود رہتا ہے: ع..... ایک ایک لڑی نظمِ ثریا سے ہو عالی، ع..... ہر مصرعۂ شاداب ہو اک پھول کی ڈالی، ع..... لفظوں کے بھی غنچے ہوں نزاکت سے نہ خالی۔ میر انیس کوئی بھی عالم بیان کر رہے ہوں لفظوں کے صوتی تاثر سے اس میں جان ڈال دیتے ہیں۔

اس طرز ادا کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ حواسِ انسانی پر اثر کرتا ہے جن میں ''بصری حس'' سب پر غالب ہے۔ یہی وہ حس ہے جس سے تصویریں بنتی ہیں۔ شاعری میں مصوری کرنا، جیسا کہ ڈاکٹر فاروقی نے لکھا ہے، میر انیس کے طرز ادا کی بنیادی صفت ہے اسی کے ساتھ وہ دوسرے حواس کو بھی لفظوں سے تصویریں بنانے کے کام میں لاتے ہیں۔ یہ حواسی تصویریں آپ کو کلامِ انیس میں عام طور پر ملیں گی مثلاً:

(۱) بصری حس سے تصویر:

اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیاہ کاروں کی — برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا — تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

ع..... کانپے جو پاؤں تھام لیا بازوئے پسر

میر انیس کا حس رجحان اس قدر تیز ہے کہ مجرد چیزوں کو بھی وہ بصری حس سے سامنے لے آتے ہیں۔ بے ثباتی کو بیان کرتے ہیں تو اس کی تصویر بھی نظروں کے سامنے آجاتی ہے:

نمود بود بشر کیا محیطِ عالم میں — ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا
چمک تھی برق کی یہ، یا کہ تھی شرر کی لپک — ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

اسی طرح دوسری حسوں کو دیکھیے۔ یہ بھی کلام انیس میں اثر و تاثیر کا رنگ گھولتی ہیں:

(۲) سماعی حس سے تصویر: ع..... کُو کُو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
(۳) حس شامہ سے تصویر: ع..... نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
(۴) حس لمس سے تصویر: ع..... آتے تھے سرد سرد جو جھونکے نسیم کے
(۵) حسِ ذائقہ سے تصویر: ع..... پانی نہیں کبھی یہ حلاوت نبات میں
(۶) حسِ رنگ سے تصویر: ع..... سنولا گیا تھا فرقِ مبارک جناب کا
(۷) حسِ حرکت سے تصویر: ع..... سمٹا جما اُڑا ادھر آیا اُدھر گیا

ع..... گھبرا کے ننھے ہاتھوں کو دے دے پٹکتا تھا

اس طرز ادا میں احساس و خیال اور حسن و جمال کے گہرے شعور کے ساتھ لفظوں کی ترتیب سے جو آہنگ پیدا ہوتا ہے، اس سے ایک لہجہ ایک مخصوص اور منفرد آواز پیدا ہو جاتی ہے جو دھیمی موسیقی کی صورت اختیار کر لیتی

Scanned with CamScanner

ہے۔ موسیقی کی یہ رفتار اس دور کی زندگی سے ہم آہنگ ہے۔ مسدس کا بند بھی اسی رفتار کا ساتھ دیتا ہے۔ غم والم اس آہنگ کی لے میں موجود ہے۔ اس میں جہاں واقعۂ کربلا کا غم شامل ہے وہاں اس مٹتی ہوئی معاشرت و تہذیب کا غم بھی سیاہی گھول رہا ہے۔ اس طرز ادا کا انداز بیانیہ شاعری کا طرز ادا ہے۔ بیانیہ شاعری میں کسی واقعہ یا واقعات کو مختلف پہلوؤں سے تسلسل کے ساتھ اس طرح، پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے ایک کہانی سی بن جاتی ہے۔ مرثیے کو دیکھیے تو اس میں بھی کسی ایک واقعہ کے مختلف پہلوؤں کو بیان کر کے کہانی کا سا رنگ اُبھارا جاتا ہے۔ ہر نوع کی بیانیہ شاعری خواہ وہ میر حسن کی ''سحر البیان'' ہو یا انگریزی شاعر چوسر کی ''کینٹر بری ٹیلز'' ہو یہی کام کرتی ہے۔ ان میں جماؤ اور ارتکاز بھی ہے اور بیانیہ ہونے کے باعث پھیلاؤ بھی موجود ہے۔ یہی صورت انیس کے مرثیوں میں ہمیں ملتی ہے۔ پھیلاؤ اور ایک ہی بات کو طرح طرح سے کہنے کا عمل مرثیے کی مجلسی ضرورت ہے۔ مرثیہ گو شیعہ عقیدہ کے لوگوں کو ذہن میں رکھ کر مرثیہ خوانی کی مذہبی رسم پوری کرنے کے لیے مرثیہ لکھتا ہے اور چونکہ موضوعِ سخن ''بین'' کی وجہ سے محدود ہو جاتا ہے اس لیے ہر بڑا مرثیہ گو، جیسے میر انیس تھے، اپنا تخلیقی جوہر دکھانے کے لیے شاعری کا کمال دکھانے پر زور دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر انیس اپنے متعدد مرثیوں میں ایک خالص شاعر نظر آتے ہیں۔ انیس کے لیے طرز ادا ہی سب کچھ ہے۔ اسی لیے وہ فصاحت و بلاغت کے سارے اصولوں کو پورا کرتے ہیں، ہر لفظ کو نہایت فن کارانہ طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ حسن و قبح کو دکھانے کے لیے موزوں ترین الفاظ لاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ متعدد ثقیل و کرخت الفاظ بھی ان کے مصرعوں میں آ کر نیا حسن اور نیا کیف پیدا کرتے ہیں اور اس کے لیے وہ بڑا ریاض کرتے ہیں۔ ان کے بہترین مرثیوں کا ہر مصرع فصاحت کا کمال ہے۔ وہ ان شاعروں میں ہیں جو زبان و بیان کی غلطیوں سے کم و بیش پاک ہیں۔ ان کی زبان اردو زبان کا معیار و حوالہ بن گئی ہے۔ لکھنؤ اور دلّی کی اردو کے بہترین اجزا ان کے ہاں جلوہ گر ہیں۔ دوسرے مرثیہ گویوں کے برخلاف ان کا کلام شتر گربگی سے بھی پاک ہے۔ ان کے کلام کا شاعرانہ اثر، اپنے رنگوں کو نکھارتا ہوا، اہلِ مجلس کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہاں رنگین بیانی، جس میں صنائع بدائع کا حسن آفریں استعمال شامل ہے، اپنی موزونیت کا کمال دکھاتی ہے۔ تشبیہہ و استعارہ فطری انداز میں کلام کا جزو بن جاتے ہیں۔ میر انیس شاعری کے مخصوص حظ و لطف سے کبھی نہیں ہٹتے۔ خالص شاعر کی حیثیت سے بھی وہ نثریت یا بناوٹ سے ہمیشہ دامن بچاتے ہیں۔ ان کے تخلیقی جوہر نے ریاضت و مشق سے مل کر ان کی شاعری میں ایک ایسا سحر پیدا کر دیا ہے جو ان کی انفرادیت ہے۔ شاعری کی ساری صفات و خصوصیات یک جا ہو کر ان کے کلام میں جادو جگاتی ہیں۔ وہ قطرے کو آب دے کر گوہر سے ملا دیتے ہیں۔ یہی ان کے طرز ادا کا کمال ہے۔

تاریخی اعتبار سے انیس کی اہمیت یہ ہے کہ جیسے، اردو شاعری جو مختلف صورتیں اختیار کر کے ولی دکنی سے اقبال تک پہنچی، اس کے اولین نقوش غالب کے ہاں ملتے ہیں، اسی طرح اردو شاعری جس طرز پر جوش ملیح

آبادی کے ہاں نظر آتی ہے، اس کے اولین نقوش میر انیس کے ہاں ملتے ہیں۔ میر انیس کے ہاں فن اپنے کمال پر آ گیا ہے لیکن ''فکر''، جیسے اقبال کے ہاں ملتی ہے، نہیں ہے۔ انیس کے ہاں بیانیہ شاعری کے وہ شہ پارے ملتے ہیں جنھیں دنیا کے ادب کے سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ انیس کے ہاں تنقیدی شعور اور تخلیقی جوہر کے امتزاج سے وہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے جو آفاقی شاعری کی جان ہے۔ بقول ڈاکٹر احسن فاروقی ان کے مراثی سے ایسے حصے الگ کر کے بیانیہ شاعری کی کامل تصویروں کا دلکش البم بنایا جا سکتا ہے۔ اس بیانیہ شاعری کا سب سے کامیاب مرثیہ وہ ہے جس کا پہلا مصرع: ''ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں'' ہے۔ فنی حسن کے پرستاروں کے لیے ان کے کلام کی دل کشی ہمیشہ باقی رہے گی۔ اصل گڑ بڑ وہاں سے شروع ہوتی ہے جب ہم جوش میں آ کر وہ ساری خصوصیات ان کے کلام سے نکال کر دکھانے کی کوشش کرتے ہیں جو اُن کے ہاں نہیں ہیں۔ وہ مشرقی روایت کے شاعر ہیں اور مغربی روایتِ شاعری سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ ان کی شاعری کو ہمیں اپنی روایتِ شاعری کے معیار سے دیکھنا چاہیے۔ حالؔی، شبلی اور اسمٰعیل میرٹھی نے ان کے طرز کی پیروی کی۔ ''مسدس حالی'' پر انیسؔ کا اثر واضح ہے۔ حالؔی کے ذریعے اقبال کے طرز اور عروض پر، خاص طور پر ''بانگ درا'' میں، انیس کی شاعری کا اثر نمایاں ہے۔ جوش ملیح آبادی اپنے پیش رووں میں دو شاعروں کا اثر خاص طور پر قبول کرتے ہیں۔ ایک نظیر اکبر آبادی اور دوسرے میر انیس کا۔ جوشؔ میر انیس کے طرز اور ان ہی کی تخلیقی صلاحیتوں کے شاعر ہیں اور وہ تبدیلی جو میر انیس اردو شاعری کی روایت میں کرتے ہیں جوش ملیح آبادی کے ہاں اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ آنے والے ادوار پر اثرات کی وجہ سے بھی میر انیس بڑے شاعر اور شاعروں کے شاعر ہیں۔ فن ہی ان کے لیے سب کچھ ہے۔ انھوں نے مرثیہ گوئی کی روایت کے سارے امکانات کو پوری طرح اپنے تصرف میں لا کر اُسے نقطۂ عروج تک پہنچا دیا اور اسی لیے آنے والے مرثیہ گو آج تک اسی روایت کی تکرار کرتے ہیں اور آگے نہیں نکل پاتے۔ اردو مرثیہ اب اسی لیے جمود کا شکار ہے۔

مطالعۂ شاعری: سلام:

مجلس میں ذاکری کا قاعدہ یہ تھا کہ پہلے دو چار رباعیاں پڑھی جاتی تھیں، پھر ایک ''سلام'' پیش کیا جاتا اور اس کے بعد ''مرثیہ'' شروع ہوتا۔ لہٰذا ہر مرثیہ گو ضرورتِ مجلس کے لیے سلام اور رباعیات بھی لکھتا۔ میر انیس نے بھی مجلسی ضرورت کے لیے سلام و رباعیاں کہیں جن کے کئی مجموعے ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے اور آج تک شائع ہو رہے ہیں۔ انیس کے سلاموں کا ایک مجموعہ ''ذخیرۂ ثواب'' کے نام سے گلبرگہ حیدر آباد دکن سے دوسری بار ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں شائع ہوا تھا اور اسی زمانے میں ''شمع تعزیت'' کے نام سے ایک مجموعہ سید محمد عنایت حسین متینؔ سہارنپوری نے مرتب کر کے ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں شائع کیا۔ کتب خانہ راجا صاحب محمود آباد کے خطی نسخے پر مبنی ایک اور مجموعۂ سلام ''گلدستۂ انیس'' کے نام سے لکھنؤ سے ۱۹۷۶ء میں

Scanned with CamScanner

شائع ہوا جس کے مرتب صغیر حسین تھے اور ایک مجموعہ ''تجلیاتِ انیس'' مرتبہ یوسف حسین شائق لکھنوی، ڈاکٹر صفدر حسین کے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۷۶ء ہی میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ انیسؔ کے سلام، مراثی انیس کی مطبوعہ جلدوں کے ساتھ بھی شائع ہوتے رہے مثلاً نائب حسین نقوی امروہوی کے مرتبہ ''مراثی انیس'' کی چار جلدوں میں سلام، مرثیے کے بعد صفحے پر بچ جانے والی جگہ پر، درج کر دیے گئے ہیں جن کی کل تعداد پندرہ ہے۔ یہی صورت رباعیات کے ساتھ ہے۔ ''مراثی انیس'' جلد پنجم و ششم مرتبہ مرزا احمد عباس مطبوعۂ بک لینڈ کراچی ۱۹۶۱ء کی دونوں جلدوں میں ۳۱ سلام اور ۳۶ رباعیاں بھی شامل ہیں۔ سلاموں کا ایک جامع مجموعہ ''انیس کے سلام'' کے نام سے علی جواد زیدی نے، اپنے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ، مرتب کیا جو ترقی اردو بیورو نئی دہلی سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں انیس کے ۱۰۲ سلام (سلام تحت اللفظ ۴۸ + سلام سوز ۵۴) اور ۱۴ نوحوں کے علاوہ متفرق کے عنوان کے تحت ایک مناجات، ایک مخمس در منقبت اور انیس ہی کی چار تضمینیں بھی شامل ہیں۔

''سلام'' کی عروضی ترکیب (ہیئت) وہی ہے جو ''سہرے'' کی ہوتی ہے اور ''سہرے'' کی وہی ہوتی ہے جو ''غزل'' کی ہوتی ہے لیکن ان تینوں کے رنگ و مزاج میں یہ فرق ہے کہ غزل میں اصل رنگ ''عشق'' بھرتا ہے اور سلام میں ''سانحۂ کربلا'' اور اس کے کردار۔ غزل میں عقیدہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن ''سلام'' میں مذہبی عقیدہ ہی رنگ گھولتا ہے۔ اسی لیے سلام بھی مرثیے کی طرح مذہبی نظم ہے۔ سلام کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ''سلام'' جو حضور اکرم ﷺ کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں اور ''میلاد شریف'' اور ''نعت خوانی'' کی محفلوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ ایک وہ ''سلام'' ہیں جو مجلسِ عزا میں پڑھے جانے کے لیے لکھے جاتے ہیں اور جن میں غزل کی طرح مختلف موضوعات پر شعر کہے جاتے ہیں اور عام طور پر قطعہ بند اشعار میں کربلا کے کسی ایک یا ایک سے زیادہ واقعہ کی طرف کھلا اشارہ کیا جاتا ہے اور ایسے شعر کہے جاتے ہیں جن سے اہلِ مجلس ''بین'' کر سکیں یا سلام کا مسکی اثر ان کے ذہن میں ایسی فضا پیدا کر دے کہ اہلِ مجلس پڑھے جانے والے مرثیے کا بینیہ اثر قبول کر سکیں۔ سلام کے لہجے اور طرز میں شوخی یا شگفتگی نہیں ہوتی بلکہ غم و الم کی مسکی لے اور اخلاقی موضوعات کی متانت شعر کی فضا کو سوگوار رکھتی ہے۔ سلام مذہبی مجلس کا حصہ ہے۔ مرثیے کی غم ناکی اس کا مزاج اور واقعۂ کربلا اس کے کردار اور زندگی کے اخلاقی پہلو اس کے موضوعات ہوتے ہیں۔

''روضۃ الشہدا'' کی روایت میں سلام شامل ہیں۔ فضلی کی ''کربل کتھا'' میں رنگِ سلام کے اشعار موجود ہیں۔ متاخرین شعرائے اردو نے بھی سلام کہے ہیں [۴۴]۔ کلیاتِ ولی دکنی میں بھی سلام موجود ہے اور ایہام گوئی کے دور (عہد محمد شاہ) کے شعرا ناجی اور مضمون کے ہاں بھی سلام ملتے ہیں۔ مرثیہ گو تقی کے سلاموں پر سودا کا جوابی رسالہ ''سبیل ہدایت'' ان کے کلیات میں موجود ہے جس کا ذکر پچھلے صفحات میں آ چکا ہے۔ میر غلام حسن ضاحک نے، جو میر انیس کے پردادا تھے، بہت سے سلام لکھے۔ علی جواد زیدی نے ان کی تعداد ۳۵

بتائی ہے اور لکھا ہے کہ ''ابتدائی دور میں سلام صرف غزل اور قصیدہ کی ہیئت یعنی منفردہ یا غزل کی ہیئت مسلم ہو چکی تھی'' [۴۵]۔ قائم چاند پوری اور میر و سودا کے کلیات میں بھی سلام موجود ہیں۔ شاہ عالم ثانی آفتاب کے میر منشی سید دہلوی کے علاوہ مصحفی، رنگین اور جرأت کے ہاں بھی سلام ملتے ہیں جن کا ادبی رنگ قابلِ ذکر ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے بھی بہت سے سلام اور بعض سنگلاخ زمینوں میں، کہے ہیں۔ ظہیر دہلوی کے مجموعۂ مراثی میں، جو ''اوراقِ کربلا'' کے نام سے شائع ہوا، ۱۹ مرثیوں کے علاوہ ایک نعتیہ سلام، ۳۷ رباعیاں اور ۱۹ سلام شامل ہیں۔ مرزا غالب کے ''دیوانِ اردو'' میں بھی ۲۱ اشعار پر مشتمل ایک ''سلام'' اور تین بند کا مسدس مرثیہ بھی موجود ہے۔ ان کے علاوہ متعدد شعرا ہیں جنھوں نے سلام کہے ہیں۔ میر خلیق، میر ضمیر، میاں دلگیر، مرزا فصیح اور میر مونس کے ہاں بھی سلام ملتے ہیں۔

مرزا دبیر اور میر انیس کے سلام بھی اسی روایت کا حصہ ہیں لیکن انیس نے، مرثیے کی طرح، سلام میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ غزل اس دور کی سب سے مقبول صنفِ سخن تھی۔ میر انیس نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل ہی سے کی تھی۔ غزل ان کے مزاج کے عین مطابق صنفِ شاعری تھی اسی لیے جب وہ سلام کہتے ہیں تو ایسے شعر بھی سلام میں آجاتے ہیں کہ اگر انھیں غزل کے اشعار میں ملا دیا جائے تو انھیں پہچاننا اور الگ کرنا مشکل ہوگا۔ ان میں ایسے اشعار بھی ہیں جن میں زندگی کے گہرے تجربوں اور مشاہدوں کو بیان کیا گیا ہے اور ایسے اشعار بھی ہیں جن میں اپنے فنِ شاعری کے بارے میں اشارے کیے گئے ہیں۔ مثلاً پہلے گہرے تجربوں اور مشاہدوں والے یہ اشعارِ سلام دیکھیے:

انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

قبر میں ہوگا حسابِ زندگی
بعد مرنے کے بھی جھگڑا رہ گیا

کسی کی ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیس
عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے اُن کے سر
آج نخوت سے زمین پر جو قدم رکھتے نہیں

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

جہاں سے اُٹھ گئے جو لوگ پھر نہیں ملتے
کہاں سے ڈھونڈھ کے اب لائیں ہم نشینوں کو

اس کا ادائے شکر ہو کس طرح اے انیس
جس نے اُٹھا کے خاک سے انساں بنا دیا

حریمِ حق میں جو پہنچے تو سر اُٹھا کے کہا
خدا کی شان کہاں آگئے کہاں سے چلے

ثابت قدم رہے رہِ حق میں مثالِ شمع
گردن سے سر جدا ہو تو پروا نہ چاہیے

جُز خدا جھکتے نہیں ہم ماسوا کے سامنے
ہاتھ پھیلائے تو نگر کیا گدا کے سامنے

Scanned with CamScanner

دنیا سے ہاتھ اُٹھا کے توکل خدا پہ کر　　ہاتھ اس لیے شریک ہیں دونوں دعا کے ساتھ
فقر کی دولت کو کیا بخشا ہے خالق نے شرف　　ہاتھ پھیلاتا ہے سلطاں بھی گدا کے سامنے
صورتِ آئینہ استغنا کے جوہر کھل گئے　　ایک درہم پر ہو اگر بند، سو در کھل گئے
ساتھ جاتا نہیں کچھ جز عملِ خیر انیس　　اس پہ انسان کو ہے خواہشِ دنیا کیا کیا
خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں　　اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے
خدا بات رکھے جہاں میں انیس　　یہ دن ہر طرح سے گزر جائیں گے
زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا　　اسی کو اہلِ جہاں انقلاب کہتے ہیں
یہ انقلاب غضب کا ہے یا علی فریاد　　کہ مسجدیں تھیں جہاں واں شراب خانہ ہوا
ورق الٹ گیا دنیا کا یک بیک کیوں چرخ　　یہ کس طرح کا زمانے میں انقلاب آیا
الٹ گیا نہ فقط لکھنؤ کا اک طبقہ　　انیس ملکِ سخن میں بھی انقلاب آیا
جو عدم سے آ گیا دنیا میں بولی اُس سے موت　　اور لو دو چار دن کے میہماں پیدا ہوئے
برق تھی گویا چمک کر چھپ گئی　　تیری مدت اے جوانی دیکھ لی
بھٹک کے راہ سے پیچھے کہیں نہ رہ جاؤ　　اٹھو انیس اٹھو کارواں روانہ ہوا

ان اشعار میں آپ گہری سنجیدگی و متانت محسوس کریں گے۔ ان میں زندگی کے تجربات و مشاہدات اس طرح بیان میں آئے ہیں کہ اس دور کی غزل ان سے خالی ہے۔ اس پائے کا ایک شعر بھی ''کلیاتِ ناسخ'' میں نہیں ملے گا۔ انیس کے موضوعات سلام میں پیری و شباب، فنا و بقا، عبرت و احساسِ مرگ، فقیری و تونگری، اخلاق کلیے، ایثار و صبر، تکبر و انکسار کے ساتھ سماجی شعور کا موضوعی اظہار بھی نمایاں ہے۔ انیس نے اردو زبان کو ایسے اشعار خاصی تعداد میں دیے ہیں جن میں زندگی کا کوئی عام لیکن اچھوتا تجربہ موجود ہے اور اس تجربے کو اس طرح ادا کیا ہے کہ اشعار ضرب المثل بن کر زبان پر چڑھ جاتے ہیں اور یہ اشعار عام طور پر سلام یا رباعیات کے اشعار ہوتے ہیں۔ اب یہ چند شعر اور دیکھیے جن میں انیس نے اپنے فن شاعری کی طرف اشارے کیے ہیں:

گھٹا زور مشقِ سخن بڑھ گئی　　ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا
مری داد دے اے زمینِ سخن　　تجھے بات میں آسماں کر دیا
نظم ہے یا دُرِ شہوار کی لڑیاں انیس　　جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں
اٹھ گیا لو شعر تو پڑھ کر انیس　　کیوں طبیعت کی روانی دیکھ لی
اے سخن نور کا سانچا ہے طبیعت میری　　کوئی کاوا ک بھی مضموں ہو تو ڈھل جائے ابھی
پوچھیے اس سے کہ درد آمیز ہو جس کا کلام　　بیتِ موزوں کوئی بے خونِ جگر ہوتی نہیں
اللہ کیا نمک ہے کلامِ انیس میں　　دشمن بھی گر پڑھے تو زباں پر مزا رہے

Scanned with CamScanner

کسی نے تری طرح سے اے انیس عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

غلط یہ لفظ، وہ بندش بُری، یہ مضموں سست ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

جسے دیکھ کر ہووے مانی کو حیرت وہ تصویر رنگیں بیاں کھینچتے ہیں

ہوا سخن کے سبب شہر شہر میں شہرہ جدھر قلم کی طرح ہم چلے، زباں سے چلے

ان اشعار سے پتا چلتا ہے کہ خود انیس اپنی شاعری میں کن باتوں اور کن پہلوؤں کا خیال رکھتے تھے۔ ایک طرف مشقِ سخن اور ریاض کی اہمیت سامنے آتی ہے اور دوسری طرف انیس موتیوں کی طرح زبان کو سجا کر ایسی لڑیاں بنانے کی بات کرتے ہیں جیسا کوئی دوسرا جوہری (شاعر) نہیں بنا سکتا۔ انیس نے اپنے کلام میں اسی طرح زبان کے استعمال سے عروسِ سخن کو سجایا ہے۔ موزوں و چست لفظوں کی ترتیب و استعمال، محاورہ و روزمرہ کی صحت اور نکھری ستھری معیاری و ٹکسالی زبان کو بیانیہ شاعری میں اس سلیقے و شعور کے ساتھ برتا ہے کہ ان جیسا کوئی دوسرا سامنے نہیں آتا۔ خالص اردو زبان انیس کے ہاں اس طرح استعمال ہوئی ہے کہ زبان کا ایک نیا معیار سامنے آتا ہے۔ انیس کی زبان میں قدامت اور متروکات بہت کم ہیں۔ شاعری ان کے لیے مصوری کا درجہ رکھتی ہے اور یہی فی الواقع ان کے سارے کلام کی منفرد خصوصیت ہے۔ زبان ہی کے باعث انیس کے کلام میں نمک کی تاثیر نے اثر کو بڑھا دیا ہے۔

میر انیس کے ہاں دو قسم کے سلام ملتے ہیں: ایک تحت اللفظ سلام اور دوسرے سلام سوز، جو مخصوص دُھن میں آلاتِ غنا کے بغیر گائے جاتے ہیں۔ میر انیس کے تحت اللفظ سلاموں میں رثائی و مسکی اثر قدرے کم ہے اور غیر مذہبی اشعار کی تعداد خاصی ہے۔ غیر مذہبی اشعار وہ ہیں جو ہم نے اوپر مثالاً درج کیے ہیں۔ سلام سوز میں رثائی رنگ گہرا ہے اور یہ شاعری کے لحاظ سے تحت اللفظ والے سلاموں کے مقابلہ میں قدرے ہلکے ہیں۔ یہی صورت ان کے ''نوحوں'' کی ہے۔ یہ بھی سرتا پا رثائیت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور مجلسی ضرورت کے باعث شاعری کا زور اسی مسکی پہلو پر رہتا ہے اور یہ بھی مرثیے سے پہلے مسکی فضا پیدا کرنے کا کام کرتے ہیں۔

انیس کے سلاموں میں بھی، مرثیے کی طرح، کربلا کی عظیم ہستیاں لکھنوی تہذیب کے رنگ میں رنگ کر اس طرح پیش کی گئی ہیں کہ ان میں وہ شجاعت و مردانگی، وہ عزم و استقلال، وہ صبر و شکر نظر نہیں آتا جن سے عظمتیں جنم لیتی ہیں حضرت امام حسین ایک عظیم مقصد کے لیے شہادت پاتے ہیں۔ وہ کسی طرح کمزور نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ وہ عزم و استقلال کا پیکر ہیں۔ جب ہم مرثیوں کی طرح سلاموں میں بھی اس قسم کے شعر پڑھتے یا سنتے ہیں تو ان عظیم ہستیوں کی عظمتوں کے نشان دھندلے پڑنے لگتے ہیں اور وہ کمزور حوصلے اور لکھنوی انداز کے انسان نظر آنے لگتے ہیں۔

دمِ قتل شہ نے کہا شمر سے ترس مجھ پہ اوبے حیا چاہیے

اگر کاٹتا ہے گلے کو مرے تو اک بوند پانی دیا چاہیے

Scanned with CamScanner

یہ سارا عمل، مرثیوں کی طرح، سلاموں میں بھی مبکی اثر پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے: ع..... دس دن یہ محرم کے ہیں رونے کے لیے ع..... رونے کا مزا ماہِ محرم میں ہے۔ مبکی اثر پیدا کرنے کے باعث ''امام مظلوم'' کا تصور پیدا ہوا لیکن ''بین'' کے رنگ نے ان عظیم ہستیوں کی عظمتوں کو مجروح کیا ہے۔ یہ چند شعر اور دیکھیے اور خود سے سوال کیجیے کہ: کیا وہ عظیم ہستیاں اپنے عظیم مقاصد کے ساتھ یہاں نظر آتی ہیں؟

رانڈوں کے منھ چھپانے کو چھوڑیں نہ چادریں — کیا دشمنی تھی شمر کو آلِ عبا کے ساتھ
کہتی تھی ہاتھ مل کے سکینہ کہ ہے غضب — دریا پہ کیوں چلی نہ گئی میں چچا کے ساتھ
نانی ٹھنڈائی لاتی تو کہتی تھی فاطمہ — صحت گئی جہاں سے شہِ کربلا کے ساتھ
جب تلخ زندگی ہو تو کیا زیست کا مزا — مجھ کو تو کوئی زہر پلا دے دوا کے ساتھ

اس قسم کے بیان سے یہ عظیم ہستیاں عرش سے فرش پر آجاتی ہیں۔ ایک طرف حضرت عباس اپنے گھوڑے کو بھی پانی نہیں پینے دیتے اور خود بھی مشک بھر کے دریا سے پیاسے لوٹ آتے ہیں۔ عطش نے گو دلِ سوزاں میں آگ بھڑکائی / مگر زباں پہ نہ حرفِ سوالِ آب آیا اور دوسری طرف یہ دکھایا جاتا ہے کہ ''امام مظلوم'' شمرِ لعین سے ترس کھانے اور ایک بوند پانی کے لیے کہہ رہے ہیں۔ آج کے قاری یا سامع کا، اس قسم کے بیان سے، اثر قبول کرنا مشکل ہے۔

مطالعۂ شاعری:

رباعیات

جیسا کہ میں نے کہا کہ میر انیس کے وہ اشعار جو زبان زد خاص و عام ہیں، زیادہ تر سلاموں یا رباعیات میں ملتے ہیں۔ دنیا اور زندگی کے بارے میں ان کے خیالات کا اظہار بھی تحت اللفظ سلاموں اور رباعیات میں ہوا ہے۔ انیس نے عام طور پر ضرورتِ مجلس کے لیے رباعیاں کہی ہیں اسی لیے ان کے موضوعات محدود ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے انیس کی رباعیوں کو مرتب رباعیات سید محمد عباس نے تین خانوں میں رکھا ہے [۴۶]:

(۱) مذہبی رباعیاں (۲) اخلاقی رباعیاں (۳) ذاتی رباعیاں

مذہبی رباعیوں میں وہ رباعیاں شامل ہیں جن میں حمد، نعت، منقبت، واقعاتِ کربلا، اہلِ بیت، آلِ عبا، بین و عزاداری، حبِ حسین، ولایتِ علی اور دوسرے مذہبی موضوعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اخلاقی رباعیوں میں بے ثباتی دہر، خیالِ مرگ، فنا و بقا، موت و حیات، عذابِ قبر، جاہ و حشم، تکبر و نخوت، تقدیر، عبرت، ہوس، پیری و شباب، شرف آدم، عقبیٰ اور دوسرے ناصحانہ موضوعات کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ ذاتی رباعیوں میں اور ان کی

Scanned with CamScanner